باسمہ تعالےٰ

پاکستان کی کہانی

(اقبال۔ جناح اور ایوب کی زبانی)

شائع کردہ

ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵ بی گلبرگ۔ لاہور

پاکستان کی کہانی

جب ہندوستان میں تحریکِ آزادی کا آغاز ہوا تو وہاں پوزیشن یہ تھی کہ ہندوؤں کی آبادی مسلمانوں سے تین گنا زیادہ تھی۔ ہندوؤں کی اسکیم یہ تھی کہ انگریزوں سے آزادی حاصل کر کے، ملک میں جمہوری انداز کی حکومت قائم کی جائے۔ جمہوری اندازِ حکومت کے معنی یہ ہیں کہ جس جماعت کی اکثریت ہو، اسی کی حکومت ہو۔ لہٰذا ہندوستان میں جمہوری اندازِ حکومت، بالفاظِ دیگر ہندوؤں کی مستقل حکومت تھی اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا، ان کے لئے انگریز کی محکومی سے نکل کر ہندوؤں کی غلامی میں زندگی بسر کرنا تھا۔ خالص سیاسی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھئے تو "آزادی" کی یہ شکل مسلمانوں کے لئے کس طرح قابلِ قبول ہو سکتی تھی؟ لیکن مسلمانوں کے لئے اس مسئلہ کا تعلق عمومی سیاست سے ہی نہیں تھا؛ ان کے دین سے بھی تھا۔ ہندو (یا ہر غیر مسلم) کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ تھا (اور ہمیشہ یہی مفہوم ہوتا ہے) کہ ملک پر اہلِ ملک کی حکومت ہو تو اسے آزادی کہتے ہیں اور اگر غیر ملک والوں کی حکومت ہو تو وہ محکومی کہلاتی ہے۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک، آزادی اور محکومی کا تصور اس سے الگ ہے۔ یہ اگر قرآنی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں، تو آزاد ہیں اور اگر ملک کا نظام غیر قرآنی ہے تو ان کی آزادی اور محکومی میں کوئی فرق نہیں۔ آزادی اور محکومی کے

آزادی اور محکومی کا اسلامی تصوّر

اس بنیادی فرق کے پیش نظر اگر ہندوستان کا ہندو مسلمانوں کو برابر کے حقوق بھی دے دیتا تو بھی مسلمان اپنے آپ کو آزاد نہیں کہلا (اور سمجھ) سکتا تھا، اس لئے کہ نظام تو وہاں بہرحال سیکولر (SECULAR) ہوتا۔ اس مقام پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ سیکولر نظام اسے کہتے ہیں جس میں مملکت کو بلا حدود و قیود قانون سازی کے اختیارات ہوتے ہیں، اور اسلامی نظام میں یہ اختیارات قرآن کے غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ یعنی اس میں اقتدار اعلیٰ (SOVEREIGNTY) مملکت کو حاصل نہیں ہوتا، کتاب اللہ کو ہوتا ہے۔

ہندوؤں (بلکہ جملہ غیر مسلموں) اور مسلمانوں کے نقاطِ نگاہ کا یہ بنیادی فرق تھا جس سے وہاں قسم قسم کے الجھاؤ پیدا ہو رہے تھے اور غیر مسلم تو ایک طرف، خود ہمارے مسلمانوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا کہ اس مشکل کا حل کیا ہے؟ لیکن یہ ہماری خوش بختی تھی کہ ہم میں ایک ہستی موجود تھی جسے مبداء فیض کی طرف سے وہ قرآنی بصیرت عطا ہوئی تھی جو ہر مشکل مرحلہ پر ملّتِ اسلامیہ کے لئے قندیلِ راہ بنتی ہے۔

علامہ اقبالؒ کا پیش کردہ حل

یہ ہستی تھی حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی۔ انہوں نے کہا (اور اسی بات کو وہ مدتوں پہلے سے کہتے چلے آ رہے تھے) کہ یہ تمام الجھنیں اس وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں کہ تم اس مفروضہ پر چلتے ہو کہ ہندوستان کی جغرافیائی حدود کے اندر بسنے والے مسلمان اور ہندو (بلکہ تمام غیر مسلم) اشتراکِ وطن کی بنیاد پر ایک قوم کے افراد ہیں۔ یہ مفروضہ سرے سے غلط ہے۔ مسلمان اشتراکِ ایمان (اسلامی آئیڈیالوجی) کی بنا پر ایک جداگانہ قوم ہیں۔ اس لئے یہاں مابہ النزاع مسئلہ ایک قوم کے مختلف افراد میں تقسیم حقوق کا نہیں۔ یہاں دو مختلف قوموں کے مستقبل اور ان کی آزادی اور محکومی کا سوال درپیش ہے۔ لہٰذا، جب تک اس سوال کو بین الاقوامی (INTER - NATIONAL) نقطۂ نگاہ سے نہیں سمجھا جائے گا، اس کا کوئی حل نہیں مل سکے گا۔ چنانچہ انہوں نے اس کا متعین حل مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد (۱۹۳۰ء) کے خطبہ صدارت میں پیش کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں ان کی آزاد و جداگانہ مملکت قائم ہو جانی چاہیے۔ انہوں نے فرمایا کہ:-

> مسلم مملکت کے لئے میرا یہ مطالبہ، ہندوستان اور اسلام، دونوں کے لئے منفعت بخش ہوگا۔ ہندوستان کو اس سے، اس (حقیقی) امن اور سلامتی کی ضمانت مل جائے گی جو قوتوں کے توازن کا فطری نتیجہ ہوگی۔ اور اسلام کو اس سے ایسا موقع میسر آ جائے گا جس سے یہ اس ٹھپہ کو مٹا سکے گا جو عرب ملوکیت نے اس پر زبردستی لگا رکھا ہے، اور یہ اس قابل ہو سکے گا کہ یہ اپنے قوانین

تعلیم اور ثقافت کو (پھر سے) زندگی اور حرکت عطا کرسکے اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر آنے کے قابل بنا سکے۔

انہوں نے، اس سے بھی پہلے (اپنے خطبات تشکیلِ الہیات میں) اس حقیقت کی وضاحت کردی تھی کہ :-

اسلامی نقطۂ نگاہ سے، مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رُو سے اسلام کے مثالی تصورات کو زمان و مکان کی قوتوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ ان بلند تصورات کو انسانی ہیئتِ اجتماعیہ میں متشکل کرنے کی آرزو کا مظاہرہ ہے۔ (صفحہ ۱۴۶)

بلکہ اس سے بھی واضح تر الفاظ ہیں کہ

اسلام تخت و تاج سے وفا شعاری کا مطالبہ نہیں کرتا۔ صرف خدا سے عہدِ وفا استوار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ (صفحہ ۱۴۰)

اس سے تحریکِ پاکستان کے تصور کا آغاز ہوا۔

قائدِ اعظم

اس کے بعد قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے اس تحریک کو عملی شکل دی۔ وہ مسلسل اور متواتر ان دو بنیادی تصورات کو دہراتے رہے جو مطالبۂ پاکستان کی اساس اور اسلامی مملکت کے لاینفک اجزائے ترکیبی تھے یعنی (۱) قومیت کا مدار آئیڈیالوجی کے اشتراک پر ہے، نہ کہ ہم وطنی پر اور (۲) اسلامی مملکت کی آزادی اور پابندی کے حدود، قرآنِ کریم کے اصول و احکام متعین کرتے ہیں۔

انہوں نے سب سے پہلے اس حقیقت کو واضح کیا کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگی۔ (مثلاً) انہوں نے ۹ دسمبر ۱۹۴۴ء کو "یومِ اقبال" کی تقریب پر، اپنے پیغام میں کہا۔

اسلامی مملکت

علامہ اقبال اگرچہ ایک عظیم شاعر اور فلاسفر تھے لیکن وہ عملی سیاست دان بھی کم پائے کے نہ تھے۔ وہ، اسلامی اصولوں پر ایمان کامل اور یقین محکم کی بنیاد پر، ان چند افراد میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے یہ تصور پیش کیا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کو (جو مسلمانوں کے تاریخی اماکن ہیں) ہندوستان سے الگ کرکے ایک اسلامی مملکت متشکل کی جاسکتی ہے۔ (تقاریرِ جناح۔ جلد دوم صفحہ ۲۳۲)

انہوں نے ۱۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو، پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا :

پاکستان کے تصور کو، جو مسلمانوں کے لیے اب ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ ان کی حفاظت، نجات اور تقدیر کا راز اسی میں مضمر ہے۔ اسی

ہے یہ آواز اقصائے عالم میں گونجے گی کہ دنیا میں ایک ایسی مسلم مملکت بھی ہے جو اسلام کی عظمتِ گذشتہ کو از سرِ نو زندہ کرے گی۔ (ایضاً صـ ۵۸)

پھر انہوں نے ۲۱ر نومبر ۱۹۴۵ء کو فرنٹیر مسلم لیگ (پشاور) کی کانفرنس میں کہا:-

مسلمان، پاکستان کا مطالبہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اس میں، اپنے ضابطہ حیات، ثقافتی نشوونما، روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ (ایضاً صـ ۲۳۴)

۸ر جون ۱۹۴۵ء کو، انہوں نے فرنٹیر مسلم سٹوڈنٹس کے نام اپنے پیغام میں کہا:-

پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم (غیر ملکی حکومت سے) آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے (حقیقی) مراد مسلم آیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ (نہایت) ضروری ہے۔ یہ بیش بہا تحفہ اور خزانہ ہمیں وراثت میں ملا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ (اس سے ہم خود ہی فیض یاب نہیں ہونگے بلکہ ہمارے ساتھ) اور بھی اس سے متمتع ہوں گے۔ . . . . ہم نے صرف اپنی آزادی حاصل نہیں کرنی، بلکہ اس قابل بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ (ایضاً صـ ۳۶)

قائدِ اعظمؒ باریک بین مقنن اور عملی سیاست دان تھے، اس لئے انہوں نے "اسلامی مملکت" کی اصطلاح کو مبہم نہیں رہنے دیا کہ (بعد میں) جس کے جو جی میں آئے اس سے مطلب اخذ کرے، اور جس قسم کی مملکت جی چاہے قائم کرکے، اس پر اسلامی لیبل لگا دے۔ انہوں نے اسلامی مملکت کے حدود متعین کر دئیے۔ اس باب میں ان کے بہت سے اقوال نقل کئے جا سکتے ہیں، لیکن، ہم سمجھتے ہیں کہ انہوں نے، ۱۹ر اگست ۱۹۴۱ء کو، حیدر آباد (دکن) میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کے سوالات کے جواب میں جو کچھ کہا، اس کے بعد کسی مزید وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ سلسلہ "سوال و جواب" گہرے غور و فکر کا مستحق ہے۔

اسلامی مملکت کیا ہوتی ہے؟

سوال :- مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب :- جب میں انگریزی زبان میں مذہب (Religion) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعوےٰ ہے، البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے

متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو نقشہ ہے اس سے بہتر تصور نا ممکن ہے۔

سوال:- اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:- اشتراکیت، بالشویت یا اسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک، دراصل اسلام اور اس کے نظام سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

سوال:- ترکی حکومت تو سیکولر اسٹیٹ ہے۔ کیا اسلامی حکومت اس سے مختلف ہے؟

اس سوال کا پہلا حصہ تو ایک جداگانہ عنوان سے متعلق ہے لیکن دوسرے حصہ میں جو کچھ قائداعظمؒ نے کہا ہے وہ اس قابل ہے کہ اس کے ایک ایک نقطہ پر بار بار غور کیا جائے۔ اس لئے کہ یہ جواب ان تمام پیچیدگیوں کو صاف کر دیتا ہے جو اسلامی آئین اور اسلامی حکومت کے متعلق عام طور پر ذہنوں میں پائی جاتی ہیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا:-

جواب: ترکی حکومت پر میرے خیال میں سیکولر اسٹیٹ کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز تو یہ بالکل واضح ہے۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

ان الفاظ پر پھر غور کیجئے کہ:-

(۱) اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔

(۲) اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص کی یا ادارہ کی۔

(۳) قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔

(۴) اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔

قائداعظمؒ کے دل میں قرآن کریم کی کس قدر عظمت تھی اور وہ اسے کس طرح زندگی کے ہر شعبہ میں مکمل اور واحد ضابطۂ حیات سمجھتے تھے، اس کا اندازہ ان کے اس پیغام سے لگائیے جو انہوں نے دسمبر ۱۹۴۵ء میں (بتقریب عید) قوم کو دیا۔ انہوں نے فرمایا:

قرآن کریم کی جامعیت اس حقیقت سے ہر مسلمان باخبر ہے کہ قرآن کے قوانین صرف مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ گبن نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ "بحرِ اوقیانوس سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے جس کا تعلق صرف الہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسانی کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں۔ اور وہ قوانین منشائے خداوندی کے مظہر ہیں"۔

اس حقیقت سے سوائے جہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ حیات ہے جو مذہب[1]، معاشرت، تجارت، عدالت، فوج، سول، اور فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی واجبات کا مسئلہ ہو یا انفرادی حقوق کا۔ اخلاقیات کا معاملہ ہو یا جرائم کا۔ اس دنیا میں مجرموں کی سزا کا سوال ہو یا آخرت کی عقوبت کا۔ ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیئے۔ (تقاریر جناح، جلد دوم، ص ۵۰۲)

انہوں نے ۲۶ دسمبر ۱۹۴۳ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی میں فرمایا۔

وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں، وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے اور وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی ہے؟

وہ بندھن اور وہ رشتہ، وہ چٹان اور وہ لنگر، خدا کی کتاب عظیم، قرآن کریم ہے۔ مجھے یقین محکم ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی ——— ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول اور ایک اُمت۔

———(○)———

[1] مذہب کے بارے میں قائداعظم کا مفہوم سابقہ انٹرویو میں سامنے آچکا ہے۔

اب اس اسلامی آئیڈیالوجی کے دوسرے حصے کو لیجئے۔ یعنی اس کے اس دوسرے عنصر کو کہ قومیت کی تشکیل اشتراکِ دین سے ہوتی ہے، نہ کہ وطن کے اشتراک سے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے علامہ اقبالؒ نے، آج سے قریب پچاس سال پہلے ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ

بنایا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے نرالا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

مسلم ہندو دو قومیں

قائد اعظمؒ نے تحریکِ پاکستان کے دوران، اس حقیقت کو اس شد و مد سے دُہرایا کہ اسے بہروں نے بھی سُنا، اور اس کے نتائج کو اندھوں نے بھی دیکھا۔ درحقیقت، مطالبۂ پاکستان کی بنیاد ہی یہی تصور تھا۔ انہوں نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سپیشل سیشن (منعقدہ ۲ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء) میں کہا:-

میں نہیں سمجھتا کہ کوئی دیانت دار آدمی بھی اس حقیقت سے اختلاف کر سکتا ہے کہ مسلمان بجائے خویش (ہندوؤں سے یکسر الگ ایک مستقل بالذات) قوم ہیں۔ (تقاریر جناح۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۵۶)

پھر انہوں نے، ایڈورڈس کالج (پشاور) میں (۲۷ نومبر سنہ ۱۹۴۵ء کو) تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر بھی ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اسی ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۴۵)

انہوں نے، ۸ مارچ سنہ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے کہا:-

ہندو اور مسلمان، خواہ وہ ایک ہی قصبہ یا گاؤں میں کیوں نہ رہتے ہوں، کبھی ایک قوم کے اجزا نہیں بن سکے۔ وہ ہمیشہ دو الگ عناصر کی حیثیت سے رہے ہیں ..... پاکستان تو اسی دن وجود میں آگیا تھا جب (ہندوستان میں) پہلا غیر مسلم، مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ (ایضاً)

اس اختلاف کو انہوں نے ہندوستان ہی میں نمایاں نہیں کیا، بلکہ سات سمندر پار، ولایت پہنچ کر بھی اس کا واشگاف الفاظ میں اعلان کیا۔ انہوں نے ۱۴ دسمبر سنہ ۱۹۴۶ء کو لندن میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

ہم اپنی جداگانہ مملکت چاہتے ہیں جس میں ہم اپنے تصور کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات ایسے بنیادی ہیں کہ زندگی کا کوئی اہم معاملہ ایسا نہیں جس میں یہ دونوں متفق ہوں۔ (ایضاً صفحہ ۵۰۳)

مطالبۂ پاکستان کا ریزولیشن، مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس، لاہور، منعقدہ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء میں پیش (اور پاس) ہوا تھا

اس اجلاس کی صدارتی تقریر میں قائداعظم نے فرمایا :-

میرے لئے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں مذہب نہیں بلکہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں، ایک قوم کا غلط تصور بہ حد اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے۔ اور ہماری بہت سی مشکلات اسی کا نتیجہ ہیں۔ اگر ہم نے بروقت اپنے رجحانات کی اصلاح نہ کی تو نتیجہ پورے ہندوستان کی تباہی ہوگا۔ یاد رکھئے کہ ہندو اور مسلمان مذہب کے معاملے میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ دونوں کا ادب جدا جدا ہے نہ تو یہ آپس میں شادیاں رچا سکتے ہیں اور نہ ایک دسترخوان پر کھانا کھا سکتے ہیں۔ حقیقتاً وہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر قائم ہیں۔ ان کی تاریخیں مختلف۔ ان کا رزمیہ جدا جدا اور مشاہیر الگ الگ ہوا ایسا ہوتا ہے کہ ان کی فتح و شکست کی حیثیتیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔

دو ایسی قوموں کو ایک نظام سلطنت میں یکجا کر دینا باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کروا دے گا جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا جائے گا۔ (قائداعظم محمد علی جناح)

ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد، اس موضوع پر کچھ اور لکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

قائداعظم کی ۱۴ راگست کی تقریر

قائداعظمؒ نے حصولِ پاکستان کے بعد، پہلے ۱۱ راگست اور پھر ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو دو تقاریر کی تھیں، جن کے بعض الفاظ کی آڑ لے کر، یہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ انہوں نے (تشکیلِ پاکستان کے بعد) اپنے سابقہ خیالات سے رجوع کر لیا تھا۔ ان تقاریر میں انہوں نے کہا تھا کہ

مملکت پاکستان میں تمہیں اس امر کی آزادی ہے کہ تم مندروں میں جاؤ یا مسجدوں میں، یا اپنی دوسری پرستش گاہوں میں، تمہارا مذہب و مسلک کچھ ہی ہو، اس کا اس بنیادی حقیقت پر کچھ اثر نہیں پڑتا کہ ہم سب ایک مملکت کے یکساں شہری ہیں ...... پاکستان کا جھنڈا کسی ایک فرد کا نہیں۔ یہ سب کا مشترکہ جھنڈا ہے۔ ..... وغیرہ وغیرہ۔

ان تقاریر سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ قائداعظمؒ نے پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے اور دین کی بنیادوں پر مسلمانوں کو ایک جداگانہ قوم قرار دینے کے خیالات کو ترک کر دیا تھا اور وہ اشتراکِ وطن کی بنیاد پر ایک سیکولر حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔

ہمارے نزدیک، قائداعظمؒ کے متعلق یہ خیال کرنا، ان کے کیرکٹر پر ایک سنگین حملہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو باتیں وہ تحریک پاکستان کے دوران اپنے عقیدے کے طور پر کہا کرتے تھے، وہ سب منافقانہ سیاسی حربے تھے۔ جب پاکستان مل گیا تو انہوں نے اس "منافقت" کو خیرباد کہہ کر اصلی حقیقت کا اظہار کر دیا! جو شخص قائداعظمؒ کی زندگی سے ذرا بھی واقف ہے، وہ ان کے خلاف شاید اور کچھ تو کہہ سکے لیکن یہ کبھی نہیں کہہ سکے گا کہ وہ منافق تھے۔ لہٰذا ان کی محولہ بالا تقاریر سے ایسا نتیجہ اخذ کرنا، نہ صرف ان کی ذات پر شدید حملہ ہے بلکہ حقیقت کے بھی خلاف ہے۔

ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ ان تقاریر کے بعض الفاظ ایسے ہیں جن سے سطح بین نگاہوں میں غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے ـــــ یا جن سے پاکستان دشمن عنصر ناجائز فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن جن حضرات کے سامنے وہ حشر انگیز حوادث ہیں جو اگست ۱۹۴۷ء میں رونما ہو رہے تھے، وہ اس سے متفق ہوں گے کہ اس وقت اس کا کسے ہوش تھا کہ وہ الفاظ کے انتخاب میں ایسی باریکیوں تک جاتا؟ اگست ۱۹۴۷ء کی تقاریر، قائداعظمؒ کی آخری تقاریر نہیں تھیں۔ وہ اس کے بعد، بھی قریب ایک سال تک زندہ رہے اور انہوں نے متعدد مقامات پر تقاریر بھی کیں اور دوسرے طریقوں سے بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ کیا ان دوران میں ان کے کسی ایک لفظ سے بھی یہ مترشح ہوا کہ وہ اسلامی مملکت اور دو قوموں کے نظریہ کے متعلق اپنے عقیدہ سے رجوع کر چکے تھے؟

ان تقاریر کا صحیح مفہوم کیا ہونا چاہئے، اس کے متعلق ہم ایک غیر مسلم کا بیان پیش کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ مسٹر جوشوا فضل الدین (JOSHUA FAZL-UD-DIN) مغربی پاکستان کی عیسائی جماعت کے لیڈر ہیں۔ وہ اپنے (انگریزی) پمفلٹ (RATIONALE OF PAKISTAN'S CONSTITUTION) میں لکھتے ہیں:-

> لہٰذا یہ کہنا کہ قائداعظمؒ نے، جو تخلیق پاکستان کے ذمہ دار تھے، حصول پاکستان کے بعد، اپنی پہلی تقریر میں کوئی ایسی بات کہی ہوگی جو پاکستان کے بنیادی مقصد کو باطل قرار دے، پاگل پن ہے۔ قائداعظمؒ نے اپنی ان ہر دو تقاریر میں جو کچھ کہا تھا وہ صرف اتنا تھا کہ پاکستان کے باشندوں کے حقوقِ شہریت، بلالحاظ مذہب و ملت، یکساں ہوں گے۔ یہی جیسنر آئین پاکستان کا بنیادی اصول ہونا چاہئے۔ اس پاکستان کا جس کا مطالبہ اس لئے کیا گیا تھا کہ اس میں اسلامی مملکت قائم ہو جائے، اور جسے ہمیشہ اصولاً اسلامی مملکت ہی رہنا چاہئے ۔۔۔۔۔۔ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق و تحفظات کا فیصلہ لامحالہ اسلامی قانون

کے مطابق کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس قانون کی تعبیر معقول انداز سے کرنی چاہئے، نہ کہ متعصبانہ تنگ نظری سے جس کی توقع موجودہ لیڈرشپ سے نہیں کی جا سکتی۔

غیر مسلم اقلیتوں کے متعلق خود قائداعظم نے (مارچ ۱۹۴۱ء میں) یہ کہہ دیا تھا کہ :-

میری تجویز یہ ہے کہ اسلامی خطہ میں ہندو اقلیت کو، بہ حیثیت اقلیت تحفظات دیئے جائیں گے۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۵۶)

لیاقت علی خان مرحوم

جب قائداعظم کی وفات کے بعد، نواب زادہ لیاقت علی خان (مرحوم) نے ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو، اسمبلی میں "قرارداد مقاصد" پیش کی تو انہوں نے اپنی تقریر میں، جہاں پاکستان کے بنیادی تصورات کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا، وہاں اس کی بھی وضاحت کر دی کہ ان خیالات کو قائداعظم کی بھی تائید حاصل رہی ہے۔ انہوں نے کہا

جناب والا! میں اس موقع کو ملک کی زندگی میں بہت اہم سمجھتا ہوں، اتنا اہم کہ میں اسے حصولِ آزادی کے بعد، سب سے اونچا درجہ دیتا ہوں۔ اس لئے کہ حصولِ آزادی سے ہمیں اس کا موقعہ ملا کہ ہم ایک مملکت کی تعمیر اور اس کے نظام سیاست کی تشکیل، اپنے نصب العین کے مطابق کر سکیں۔ میں اس ایوان کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ بابائے ملت، قائداعظم نے اس مسئلہ کے متعلق اپنے جذبات و احساسات کا اظہار متعدد بار فرمایا تھا اور ملت نے ان کے خیالات کی تائید غیر مبہم الفاظ میں کی تھی۔ پاکستان اس لئے قائم کیا گیا تھا کہ اس برصغیر کے مسلمان اپنی زندگی کی تعمیر اسلامی تعلیمات و روایات کے مطابق کرنا چاہتے تھے، تاکہ وہ دنیا پر عملاً واضح کر دیں کہ آج انسانی زندگی میں جو گوناگوں بیماریاں پیدا ہو گئی ہیں، اسلام ان سب کے لئے اکسیرِ اعظم کا حکم رکھتا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا :-

ہم اہلِ پاکستان میں اتنی جرأت ہے کہ ہم اپنے اس ایمان محکم کا اعلان کر دیں کہ مملکت کے تمام اختیارات و اقتدارات، اسلام کے مقرر کردہ معیاروں کے مطابق استعمال کئے جائیں ...... لیکن میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس سے ہماری مراد یہ نہیں کہ ہم یہاں تھیا کریسی انداز کی حکومت قائم کریں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حکومت کا حق مذہبی پیشواؤں کو حاصل ہے۔ یہ تصور بالکل غیر اسلامی ہے۔

پاکستان کی مجوزہ اسلامی مملکت کے متعلق انہوں نے کہا :-

آپ کو یاد ہوگا کہ قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کے دیگر راہ نماؤں نے ہمیشہ یہ غیر مبہم اور واضح اعلانات کئے کہ پاکستان کا مطالبہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ مسلمانوں کا اپنا مخصوص طریق زندگی اور ضابطۂ عمل ہے۔ انہوں نے بار بار اس حقیقت کو دہرایا کہ اسلام، خدا اور بندے کے درمیان نجی تعلق کا نام نہیں جسے امور مملکت میں کسی قسم کا دخل نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام، تمدنی امور کے لئے متعین ہدایات دیتا ہے اور اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ وہ زندگی کے روزمرہ کے مسائل میں، معاشرہ کے طرزِ عمل کی راہ نمائی کرے۔ اسلام، ذاتی عقائد اور اخلاق کا نام نہیں۔

اقلیتوں کے حقوق کے متعلق انہوں نے کہا

ہم نے اپنے اس شوق و آرزو میں کہ ہم ایک اسلامی معاشرہ کی تعمیر کریں، غیر مسلموں کے حقوق کو نظرانداز نہیں کیا۔ اگر ہم ایسا کرتے تو ہمارا یہ طرزِ عمل غیر اسلامی ہوتا۔ اگر ہم غیر مسلموں کی (مذہبی) آزادی کو سلب کرتے تو اس سے ہم اپنے دین کی حدود شکنی کے مجرم قرار پاتے۔

ان غیر مبہم اعلانات کے ساتھ مملکت پاکستان کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔

—— (٭) ——

معاشی نظام

کسی مملکت کے سیاسی نظام کے اصولوں کے تعین کے بعد، سب سے پہلا سوال معاشی نظام کا ہوتا ہے۔ یوں تو نظامِ معیشت کی اہمیت ہر زمانے میں رہی ہے لیکن عصرِ حاضر میں اس نے ایسی حیثیت اختیار کرلی ہے کہ باقی تمام مسائلِ حیات اس کے زیرِ سایہ چلتے ہیں۔ سیاسی نظام کی طرح، قرآن اپنا مخصوص معاشی نظام رکھتا ہے۔ جب علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور دیا، تو قرآن کا معاشی نظام خصوصیت سے ان کے پیشِ نظر تھا۔ اس کے متعلق انہوں نے ۱۹۳۷ء میں قائداعظمؒ کے نام اپنے ایک خط میں لکھا۔

سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہے۔ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک اس سے بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما دی جاسکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ

> کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش ضرور مل جاتا ہے۔ اگر ہندوؤں نے سوشل ڈیماکریسی (SOCIAL DEMOCRACY) کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندو مت کا خاتمہ ہو جائے گا لیکن اسلام کے لئے سوشل ڈیماکریسی کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے نہ ٹکرائے اسلام میں کسی تبدیلی کے مترادف نہیں ہو گا بلکہ اس کے مفہوم یہ ہو گا کہ ہم اسلام کو پھر سے اس منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا کہ شروع میں تھا۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد جولائی سنہ ۱۹۴۸ء میں قائدِ اعظمؒ نے اسٹیٹ بنک کا افتتاح کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی اس میں اسلام کے عدلِ عمرانی (SOCIAL JUSTICE) کو پاکستان کے معاشی نظام کی بنیاد قرار دیا (واضح رہے کہ یہ تقریر، اگست سنہ ۱۹۴۷ء کی تقاریر کے قریب ایک سال بعد کی، اور غالباً قائدِ اعظمؒ کی زندگی کی آخری تقریر ہے)۔ اس میں انہوں نے فرمایا۔

> ہمارے پیشِ نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوش حالی اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس مقصد کا حصول، مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیئے۔ اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے جو انسانی مساوات اور عدلِ عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ صرف یہی وہ طریق ہے جس سے ہم اس فریضہ سے عہدہ برآ ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عاید ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ پیغامِ امن دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچائے گا اور نوعِ انسان کی بہبود، مسرت اور خوش حالی کا ضامن ہو سکے گا۔ یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔

اسی حقیقت کو نوابزادہ لیاقت علی خان (مرحوم) نے اپنی مذکورہ صدر تقریر میں دہرایا، جب کہا کہ:-

> ہمارا ارادہ یہ بھی ہے کہ ہم پاکستان کے معاشی نظام کو اسلامی اصولوں کی بنیادوں پر استوار کریں جس کا مقصد دولت کی بہتر تقسیم اور محتاجی کا دور کرنا ہے۔

ان حسین تمناؤں اور مقدس آرزوؤں کے ساتھ، مملکتِ پاکستان کا آغاز ہوا۔

آئین سازی کا مرحلہ

تشکیلِ مملکت کے بعد سب سے پہلا کام مملکت کے لئے آئین کی تدوین تھا۔ اس لئے کہ آئین ہی وہ مخصوص اور بنیادی ہیکل ہوتا ہے جو ان مقاصد کا مظہر ہوتا ہے جس کے لئے مملکت وجود میں آتی ہے۔ جن مقاصد کی بروئے مندی کے لئے مملکتِ پاکستان وجود میں آئی تھی وہ (جیسا کہ ہم سابقہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں) اس قدر واضح اور غیر مبہم تھے کہ ان کی روشنی میں آئینِ مملکت

کی تدوین کا کام کچھ بھی مشکل نہ تھا لیکن، گوناں گوں اسباب وعلل کی بناء پر اسے ایسا مشکل اور پیچیدہ بنا دیا گیا کہ آٹھ نو سال تک یہ مسئلہ، بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح ایک ہی مقام پر گردش کرتا رہا۔ اس کے بنیادی ذمہ دار، دو بڑے بڑے عنصر تھے —— ایک مفاد پرست سیاسی لیڈروں کا گروہ اور دوسرا وہ اقتدار پرست طبقہ جو مذہبی نقاب اوڑھ کر، حکومت کی مسندوں کو اپنے لئے مختص کر لینا چاہتا تھا۔ یہ دوسرا گروہ، پہلے سے بھی زیادہ خطرناک تھا، اس لئے کہ یہ اپنی ہوسِ اقتدار کو "خدا اور رسول" کے نام کی اوٹ میں آگے بڑھاتا اور شریعت کے نام کی آڑ میں عوام کے جذبات سے کھیلتا تھا۔ اس نے، سب سے پہلے "بے حد و نہایت سرمایہ داری، اور لامحدود زمینداری" کو عین اسلام قرار دے کر، سرمایہ دار اور زمیندار طبقہ کی حمایت حاصل کی، اور ان کے بل بوتے پر اپنے پراپیگنڈا کی مشینری کو اتنا وسیع اور محکم کر لیا کہ ان کے سامنے کسی دوسرے کی آواز ابھر ہی نہیں سکتی تھی۔

مذہب کی آڑ میں سیاست

یہ حضرات، تحریکِ پاکستان کے دوران، مطالبہ پاکستان کے سب سے بڑے مخالف تھے اور ان کی یہ مخالفت، آٹھ دس سال تک مسلسل اور پیہم جاری رہی لیکن پاکستان بننے کے بعد، یہ اپنے آپ کو حکومت کی کرسیوں کا واحد حقدار قرار دیتے تھے۔ ان کے اس استحقاق کا "صغریٰ کبریٰ" یہ تھا کہ (۱) پاکستان ایک اسلامی مملکت بننے کے لئے وجود میں آیا ہے۔ (۲) اسلامی مملکت میں، شریعت کا قانون نافذ ہوگا۔ اور (۳) یہ ہم ہی بتا سکتے ہیں کہ قانونِ شریعت کسے کہتے ہیں۔ لہٰذا، کاروبارِ حکومت ہماری تحویل میں رہنا چاہیئے۔ ان کے پروپیگنڈہ کا اثر یہاں تک پہنچا کہ (اس زمانے کی) مجلسِ آئین ساز کی متعین کردہ، بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے یہ تجویز پیش کر دی کہ ایک علماء بورڈ مقرر کیا جائے جو ہر قانون کے متعلق فیصلہ کیا کرے کہ وہ شریعت کے مطابق ہے یا نہیں۔ اور ان کا فیصلہ ناطق سمجھا جائے۔

علماء بورڈ کی تجویز

اس تجویز کی رُو سے مملکت کا اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGN POWER) اس "مذہبی پیشوائیت" کے ہاتھوں میں چلا جاتا تھا جو سنہ ۱۹۴۳ء سے اس کے حصول کے لئے کوشاں تھی جب اس نے اپنے عزائم کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ:—

> یہ پارٹی اسلام کے اصولوں پر ایک نئے اجتماعی نظام اور ایک نئی تہذیب کا پروگرام لے کر اٹھے اور عامۃ خلائق کے سامنے اپنا پروگرام پیش کر کے زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت فراہم کرے اور بالآخر حکومت کی مشینری پر قابض ہو جائے۔ (ترجمان القرآن، دسمبر سنہ ۱۹۴۳ء)

یہ تو خیر گذری کہ وہ اسمبلی ہی کالعدم قرار پا گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی تجاویز اور سفارشات بھی غتربود ہو گئیں، ورنہ اگر (پناہ بخدا) اس کا تجویز کردہ آئین نافذ ہو جاتا تو کوئی شریف آدمی یہاں آزادی کا سانس،

ہو رہے سکتا۔ اس لئے کہ انہوں نے پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ ہماری قائم کردہ حکومت "فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے ایک گونہ مماثلت رکھے گی"۔ (اسلام کا نظریہ سیاسی ۔ از ابوالاعلیٰ صاحب مودودی)

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ صرف ان اقتدار پرستوں کا پیدا کردہ الجھاؤ تھا جس کی وجہ سے آئین سازی کے متعلق عجیب عجیب قسم کی پیچیدگیاں سامنے آئی تھیں، ورنہ یہ بات اس قدر آسان اور صاف تھی کہ اس

اسلامی آئین کا بنیادی اصول

میں کسی الجھن اور پیچیدگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسلامی آئین کی بنیادی خصوصیات کیا ہوتی ہیں، اس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے (جنہوں نے پاکستان کا تصور دیا تھا) اپنے مخصوص انداز میں وضاحت کر دی تھی۔ انہوں نے اپنے خطبات (تشکیل الٰہیات میں) ۱۹۲۸ء میں لکھا تھا کہ

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلق سے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں ۔ وہ تغیر جسے خود قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ...... تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی و سیاسی دوائر میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے ۔ (خطبات صـ ۱۴۷)

اس کا مطلب صاف ہے۔ اسلام زندگی کے کچھ اصول دیتا ہے جن کی حیثیت عالمگیر ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہتے ہیں۔ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، ہر نئی نسل آزاد ہوتی ہے کہ وہ اپنے معاملات کا حل اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود تلاش کرے۔ اس طرح ثبات و تغیر کے اس حسین امتزاج سے کاروانِ انسانیت اپنی ارتقائی منزل طے کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ غیر متبدل اصول قرآن کریم کے اندر محفوظ کر کے دے دیئے گئے ہیں۔ لہٰذا، قرآن ہی وہ ضابطۂ حیات ہے جو اسلامی آئین کی اصل و بنیاد قرار پاتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے یہ سوال سامنے لایا جاتا تھا کہ احادیث کی کیا پوزیشن ہے۔ علامہ اقبالؒ

نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے، وضاحت سے بتایا کہ احادیث زیادہ سے زیادہ ان فیصلوں کا سراغ دیتی ہیں جنہیں نبی اکرمؐ نے (جنہوں نے سب سے پہلی اسلامی مملکت کی تشکیل فرمائی تھی) اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، قرآنی اصولوں کی روشنی میں، نافذ فرمائے۔ یہ فیصلے ابدی طور پر غیر متبدل نہیں ہیں چنانچہ (انہوں نے کہا کہ) اس باب میں امام ابو حنیفہؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا بھی یہی مسلک ہے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس سلسلہ میں آپ کے سامنے علامہ اقبالؒ کے اپنے الفاظ پیش کر دیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کا یہ اقتباس طویل ہے لیکن اس کے بغیر اس اہم نکتہ کی وضاحت نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے خطبات میں لکھتے ہیں:-

> احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانہ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحب نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے۔ اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوع انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے حالات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے اس طریق کار کی رو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی اس لئے انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنے فقہ کی تدوین

میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ اُن کے زمانے میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اول تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالک اور زہری کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحب تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں۔ تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل سے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہِ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔ (خطبات اقبال صفحہ ۱۶۴ - ۱۶۳)

اس اقتباس میں، علامہ اقبالؒ نے امام ابوحنیفہؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے مسلک کا حوالہ دیا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کے فلسفہ کے سب سے بڑے شارح، مولانا عبیداللہ سندھی (مرحوم) تصور کئے جاتے ہیں۔ وہ اس باب میں لکھتے ہیں:۔

واضح رہے کہ جب اساسی قانون پر عمل درآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ قانونِ اساسی غیر متبدل ہوتا ہے اور تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم سنت ان تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں جو رسول اللہؐ اور آپ کے بعد خلفاء نے مثلاً لے مسلمانوں کی مرکزی جماعت کے مشورے سے تجویز کئے۔ خلافتِ عثمانیؓ کے بعد یہ نظام ٹوٹ گیا کہ تمام کام مشورے سے کئے جائیں۔ سنت کو ہمارے فقہائے حنفیہ رسول اللہؐ اور خلفائے راشدینؓ میں مشترک مانتے ہیں۔ اور یہی ہماری رائے ہے۔ یہ سنت قرآن ہی سے پیدا ہوگی۔ آج کل کی اصطلاح میں اس کو بائی لاز کہا جاتا ہے ..... اصل قانون اساسی متعین ہے۔ بائی لاز اس وقت اور تھے اس وقت اور ہوں گے جن میں زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق تدریجی تبدیلیاں ہوں گی۔ نئی نئی پیش آمدہ صورتوں کے متعلق تفصیلی احکام کا استخراج ہوگا اور اسی کا نام فقہ ہے۔ (الفرقان - ولی اللہ نمبر صفحہ ۲۶۳)

جہاں تک امام ابو حنیفہؒ کا تعلق ہے، خطیب بغدادی نے اپنی مشہور تاریخ میں متعدد اسناد سے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ وہ (امام اعظمؒ) احادیث کے متعلق وہی عقیدہ رکھتے تھے جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے اشارہ کیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتا ہے کہ:-

> ابو عوانہ نے بیان کیا کہ "میں ایک روز ابو حنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی آیا اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چرا لیا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے ابو حنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو ایلچی چلا گیا تو میں نے ابو حنیفہؒ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ مجھ سے یحییٰ بن سعید نے بیان کیا انہوں نے محمد بن حبان سے۔ انہوں نے رافع بن خدیجؓ سے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ پھل پھلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ فوراً اس آدمی کی مدد کو پہنچو ورنہ اس کا ہاتھ کٹ جائے گا۔ اس پر ابو حنیفہؒ نے بتایا کہ وہ حکم گذر چکا اور ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس چور کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔
>
> (خطیب بغدادی - جلد ۱۳ - صفحہ ۳۹۰)

اس سلسلہ میں وہ لکھتا ہے :-

> ابو حنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ "اگر مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا (یعنی دونوں ایک زمانے میں ہوتے) تو آپ میرے بہت سے اقوال اختیار فرما لیتے۔ دین اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے" (ایضاً)

فقہ کی حیثیت

جہاں تک فقہ کا تعلق ہے، علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں :-

> جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے خود اپنے مکتب فقہ کی روح کے خلاف امام ابو حنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے بعینہٖ اسی طرح جس طرح امام ابو حنیفہؒ کے ناقدین نے ان فیصلوں کو ابدی قرار دے لیا تھا جو عہد رسالتمآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔ (خطبات - صفحہ ۱۲۹)

قرآن، حدیث اور فقہ (تینوں) کے صحیح مقام کے متعلق بحث کرنے کے بعد علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں :-

> یہ سوال زود یا بدیر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جد و جہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہونا چاہئے، بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا حریت پسند قلب ہے، وہ جسے رسول اللہؐ کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ ——— حسبنا کتاب اللہ۔ (ایضاً - صفحہ ۱۵۴)

یہی وہ حقیقت تھی جسے (جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں) قائد اعظم نے ۱۹۴۸ء میں ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت و وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے اصول متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔

اگر اس اصل الاصول کو، آئین سازی کا مرکز قرار دے دیا جاتا، تو اسلامی آئین کی تدوین میں کوئی مشکل ہی پیش نہ آتی۔ اس لئے کہ جہاں تک دین کے اصولوں کا تعلق ہے، خود قدامت پرست طبقہ کو بھی اس کا اعتراف

قدامت پرست طبقہ کا اعتراف

ہے کہ وہ سب کے سب قرآن کریم کے اندر ہیں، اور تمام مسلمانوں کے نزدیک مشترکہ طور پر واجب التسلیم۔ چنانچہ اس باب میں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب لکھتے ہیں:-

دین کے اصول سب کے سب کتاب اللہ میں موجود ہیں جو روایات سے بالاتر اور سب مسلمانوں میں مشترک ہیں۔ (تفہیمات - جلد اول - صفحہ ۳۲۹)

وہ اپنی کتاب رسائل و مسائل میں لکھتے ہیں:-

یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جن چیزوں پر کفر و اسلام کا مدار ہے اور جن امور پر انسان کی نجات موقوف ہے انہیں بیان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں۔ اور قرآن میں بھی ان کو محض اشارۃً و کنایۃً بیان نہیں کیا گیا۔ بلکہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ ان علینا للھدیٰ (صفحہ ۶۲)

وہ اپنی تفسیر، تفہیم القرآن (صفحہ ۵۹۵) میں لکھتے ہیں:

حرام اور حلال ۔ ۔ ۔ ۔ جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنا۔ اور انسانی زندگی کے لئے قانون اور شرع تجویز کرنا، یہ سب خداوندی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا شرک ہے۔

اسی حقیقت کی تشریح کرتے ہوئے وہ تفہیمات حصہ دوم (صفحہ ۳۲۹) میں لکھتے ہیں۔

اسی اصل کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جو ابو داؤد نے سلمان فارسیؓ سے بدیں الفاظ نقل کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ (الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام

ما حرم الله فی کتابه - وما سکت عنه فھو مما عفا عنه

حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا۔ رہی وہ چیزیں جن کا ذکر نہیں کیا گیا ۔ تو وہ معاف ہیں

پھر قرآن کریم کا انداز بیان ایسا صاف، سیدھا اور واضح ہے کہ اس کے سمجھنے میں کسی قسم کا ابہام نہیں رہتا ۔ مودودی صاحب کے الفاظ میں

قرآن اپنے مدعا کو بغیر کسی ابہام کے صاف صاف بیان کرتا ہے اور اس نے کسی ایسی حقیقت کو جس کا جاننا اس کے لئے ضروری تھا، واضح کئے بغیر نہیں چھوڑا۔ (ترجمان القرآن ۔ بابت اپریل مئی سنہ ۱۹۵۵ء)

لیکن افسوس کہ، قرآن کریم سے متعلق یہ کچھ کہنے کے باوجود اسے آئین کی بنیاد نہ بنایا گیا (اور اس کی وجہ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں) اور یہ خواب، کثرت تعبیر سے، پریشان تر ہوتا چلا گیا ۔ بالآخر نو سال کا طویل اور قیمتی وقت ضائع کرنے کے بعد (سنہ ۱۹۵۶ء کا) وہ آئین وجود میں آیا جسے اسلامی کہنا تو درکنار، عام اصطلاح میں قابلِ عمل سیاسی آئین بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ البتہ اس میں مذہبی پیشوائیت کے لئے اقتدار یابی کی کافی گنجائش رکھی گئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اسے "اسلامی آئین" قرار دے کر جشنِ مسرت منایا تھا۔ قوم کا سنجیدہ طبقہ اس سے جس قدر افسردہ خاطر تھا، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ اب انہیں، پاکستان میں آزادی کی زندگی بسر کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی ۔

لیکن کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ فطرت کو مملکتِ پاکستان کی بقاء اور یہاں کے رہنے والوں کی بہبود خاص طور پر منظور ہے چنانچہ، جس طرح پہلی مجلس آئین ساز کے (غیر متوقع طور پر) ٹوٹنے سے، یہاں حیاتِ نو کا امکان پیدا ہو گیا تھا، سنہ ۱۹۵۶ء کے آئین کی زنجیروں سے رستگاری کے لئے بھی ——— دستِ از غیب برون آید و کارے بکند ——— کی شکل پیدا ہو گئی ۔

عسکری انقلاب

اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء میں یہاں عسکری انقلاب آیا، جس نے ایک قطرۂ خون بہائے بغیر، سابقہ آئین، اور اس کی بساط پر مشغولِ مہرہ بازی اربابِ اقتدار (اور ان کی ہمنوا مذہبی پیشوائیت) کا تختہ الٹ دیا۔ اس تخریب (ولا) کے بعد فیلڈ مارشل محمد ایوب خان ۔ نے (۲۱ دسمبر سنہ ۱۹۵۸ء کو لاہور میں) اعلان کیا کہ

اکتوبر کے انقلاب کا فلسفہ وہی تھا جو پاکستان کی تخلیق کا موجب بنا تھا۔ برسوں کی بدنظمی اور بد دیانتی نے اس فلسفہ کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا اور اس تحریک کے اغراض و مقاصد کو داغ دار اور زنگ آلود بنا دیا تھا جو تشکیل پاکستان پر منتج ہوئی تھی۔ اب حکومت کے سامنے سب سے اہم کام یہ ہے کہ ان مقاصد و مطامح کو اس دلدل سے نکال کر اس طرح صیقل کر دیا جائے کہ نہیں

ان کی کھوئی ہوئی چمک دمک اور گم گشتہ عزت و عظمت پھر سے نصیب ہو جائے۔

(طلوع اسلام۔ جنوری ۱۹۵۹ء)

یعنی انہوں نے اعلان یہ کیا کہ اس انقلاب کا مقصد یہ ہے کہ مملکت پاکستان کو اس آئیڈیالوجی کا محسوس پیکر بنایا جائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا تھا اور جس کی تصریح اقبال اور جناح نے اس شدومد سے کی تھی۔ بالفاظ دیگر اس انقلاب سے قوم پھر اس مقام پر آگئی جہاں وہ ۱۹۴۷ء میں کھڑی تھی۔ اسے پھر سے ایک "صاف لوح" مل گئی جس پر یہ اپنی تقدیر از سرنو اپنے ہاتھ سے لکھنے کے قابل ہو گئی۔ صدر پاکستان، اس وقت سے آج تک، اپنے ان عزائم کو بار بار دھراتے چلے جا رہے ہیں اور ہر مقام پر اس کا اعلان کر رہے ہیں کہ ہمارے پیش نظر اسی اسلامی آئیڈیالوجی کا احیاء ہے جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا تھا۔ انہوں نے ۹ مارچ ۱۹۵۹ء کو راولپنڈی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا :-

اسلامی آئیڈیالوجی کا احیاء

ہمارا سب سے مقدم فریضہ یہ ہونا چاہئے کہ ہم اُس آئیڈیالوجی کا احیاء اور استحکام کریں جس کی رُو سے پاکستان بحیثیت ایک آزاد مملکت کے وجود پذیر ہوا۔ پاکستان محض ایک خطۂ زمین کا نام نہیں جس میں آٹھ کروڑ نفوس بستے ہیں۔ پاکستان سے ہماری مراد ایک ایسی ملت ہے جو مخصوص اخلاقی اور روحانی اقدار کی امین ہے یہ اقدار اسلام پر مبنی ہیں۔ ہمارے تجدد پسند حضرات کے نزدیک اسلام کا نام پسماندگی کے خلاف اور قدامت پرستی کی دلیل ہے۔ یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان پر ترس کھایا جائے۔

پھر انہوں نے (جولائی ۱۹۵۹ء میں) مری میں کمشنروں کی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

ہمارے سامنے اس وقت دو اہم مسائل ہیں۔ ایک یہ کہ ہم ایک مشترک اسلامی آئیڈیالوجی کے ماتحت لوگوں میں اتحاد پیدا کریں اور اس آئیڈیالوجی کی تشریح و تعبیر عصر حاضر کی زبان میں زمانے کے موجودہ تقاضوں کے مطابق کی جائے۔ اس آئیڈیالوجی کو روح اسلام سے کشید کیا جائے اور ہمارا زمانہ جس حد تک ترقی کر چکا ہے اس کی روشنی میں اس کی تعبیر کی جائے۔ اس وقت اشد ضرورت اس امر کی ہے کہ اہل فکر و نظر کو دعوت غور و تدبر دی جائے کہ وہ زندگی کے ان مسائل کا نہایت معقول حل دریافت کریں۔

قرآن کا معاشی نظام

دوسرا اہم کام یہ ہے کہ ملک کا معاشرتی اور معاشی ڈھانچہ ٹھوس اور مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ انسانی دل و دماغ کسی آئیڈیالوجی پر خواہ وہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو کبھی لبیک نہیں کہتا جب تک اسے دو وقت پیٹ بھرنے کا یقین نہ ہو جائے۔ اس لئے اس امر کی بھی اشد ضرورت ہے کہ روٹی کے مسئلہ پر خاص توجہ دی جائے۔

نشتر والہ بار میں علماء کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

آج دنیا دو کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اور ان کی باہم کش مکش آئیڈیالوجی پر مبنی ہے۔ کمیونزم تہیہ کر چکی ہے کہ وہ اپنی آئیڈیالوجی تمام دنیا پر مسلط کر دے۔ مغرب کمیونزم کا کوئی موثر اور مکمل جواب نہیں پیش کر سکا۔ اس لئے کہ اس کی آئیڈیالوجی بنیادی طور پر مادہ پرستی پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو اقدار مادیت سے متوازی ہوتی ہیں نظام کائنات میں ان کا بھی ایک مقام ہے لیکن وہ ایسی اہم نہیں کہ نوع انسانی ان کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دے۔ اندریں حالات کمیونزم کا ایک اور صرف ایک جواب ہے اور وہ جواب اسلام سے مل سکتا ہے کمیونزم کا فلسفہ اور مغرب کی مادی اقدار کی کش مکش میں صرف اسلام ہی وہ فطری آئیڈیالوجی بن سکتا ہے جو روحِ انسانیت کو ہلاکت سے بچا سکتی ہے۔

کمیونزم کا جواب

اسی خطرہ کی روک تھام کے سلسلے میں انہوں نے فرمایا :-

کمیونزم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کو ماضی کے خلوت کدوں سے نکال کر عصر حاضر کی روشنی اور زبان میں پیش کیا جائے۔ اسے صرف ایک نظری آئیڈیالوجی کی حیثیت سے پیش نہ کیا جائے بلکہ ایک تمدنی۔ سیاسی۔ معاشی اور روحانی زندگی کے لئے مکمل ضابطہ حیات کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ یہی اسلام کی صحیح اور بنیادی پوزیشن ہے۔

آئین پاکستان کے سلسلے میں انہوں نے ۱۷ دسمبر سنہ ۱۹۵۹ء کو پاک جمہوریہ کے دورہ کے سلسلہ میں ایک مقام پر کہا جہاں تک اسلامی اصولوں کا تعلق ہے پاکستان کا دستور یقیناً ان کا آئینہ دار ہوگا لیکن اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام کے اصول غیر متبدل رہتے ہیں لیکن ان کی جزئیات تفصیلات اور طریقے حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ان جزئیات کو ہمارے موجودہ حالات کے مطابق مرتب ہونا چاہیے۔

اصول اور جزئیات

آپ ان الفاظ پر پھر غور کیجئے کہ "اسلام کے اصول غیر متبدل رہتے ہیں لیکن ان کی جزئیات تفصیلات اور طریقے، حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں" یہ ہے اسلامی آئین کی وہ اصل بنیاد جسے علامہ اقبالؒ نے سنہ ۱۹۲۸ء میں پیش کیا تھا۔ صدر پاکستان نے اس حقیقت کو عسکری انقلاب کی دوسری سال گرہ کی تقریب پر (۲۶ اکتوبر کی شام کو) اپنی نشری تقریر میں علامہ اقبالؒ کے حوالہ سے ان الفاظ میں دہرایا :-

علامہ اقبالؒ نے جن کا شمار عصر حاضر میں روحِ اسلامی کے بہترین روشن دماغ ترجمانوں میں ہوتا ہے کس قدر سچی بات کہی ہے کہ اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیات کلی کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر اور تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ ایک معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ اس کے

پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم وضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر وتبدل کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان نہیں، وہ تغیر جسے خود قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ——— تو اس سے زندگی، جو حتماً متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو سیاسی اور روحانی دوائر میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ ابدی اقدار پر ان کی گرفت نہیں رہی تھی۔ اور گذشتہ کئی صدیوں میں اسلام کی قوت میں جو ضعف آیا ہے تو اس کی وجہ یہی جمود وتعطل تھا۔

اسلام کی تاریخ میں پہلا وقت آیا ہے کہ تو کروڑ مسلمانوں کو اس بات کا موقع ملا ہے کہ وہ اپنے ایمان اور زندگی کے روزمرہ کے مسائل میں امتزاج پیدا کرنے کے پروگرام میں شریک ہو سکیں۔

اسی سلسلہ میں انھوں نے آگے چل کر اپنے علامہ اقبال کے یہ الفاظ پیش کئے:-

قرآن کریم کی اہم تعلیمات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حیات ایک ترقی پذیر مسلسل عمل تخلیق ہے اس لئے ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے وہ اپنی مشکلات کا حل آپ تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں اپنے اسلاف (کے علمی سرمایہ) سے راہ نمائی لے لیکن اسلاف کے فیصلے ان کی راہ میں روک نہیں بن سکتے۔

اس کے بعد انہوں نے بتایا کہ اس سلسلہ میں کرنے کا کام کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے دو ایسی بنیادی حقیقتوں کی نشاندہی کی جو فی الواقعہ ہماری اولین توجہات کی مستحق ہیں۔ انہوں نے کہا۔

ہمارے سامنے پہلا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے معاشرہ کو از سر نو منضبط کریں اور اسلامی آئیڈیالوجی کو اس کی بنیاد قرار دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ مقصد تھا جو تخلیق پاکستان کے لئے وجہ جواز قرار پایا تھا۔ اس مقصد کی طرف پہلا قدم اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے قلوب و اذہان کو دو قسم کی نفسیاتی الجھنوں سے آزاد کرائیں۔ ان میں سے ایک الجھن جدید تعلیم کی پیداوار ہے۔ یہ تعلیم ہمارے دور غلامی میں رائج کی گئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے ہاں کی ہر شے (جس میں دین بھی شامل ہے) فیشن کے خلاف سمجھی جانے لگی۔

دوسری الجھن ان جامد عقائد کی پیداوار ہے جنہوں نے دین کی روح کو تعصب، توہم پرستی اور تنگ گھونٹ دینے والے خیالات کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب سی دکھائی دے گی لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارا برائے نام نہاد تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقہ، دونوں ایک مشترکہ پلیٹ فارم

پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور وہ پلیٹ فارم ہے "دینی جہالت" (یعنی دین کے متعلق نہ انہیں کچھ علم ہوتا ہے نہ اِنہیں)

غور کیجئے! انہوں نے کس طرح اس گہری حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ جہاں تک دین کے صحیح علم کا تعلق ہے

دین سے جہالت

اس سے ہمارے نام نہاد "علمائے کرام" بھی اسی طرح کورے ہیں جس طرح مغربی تعلیم یافتہ طبقہ، یہ جہالت کے پلیٹ فارم پر یہ دونوں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

صدر محترم کے نزدیک یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ انہوں نے مشرق وسطی کے اپنے حالیہ دورہ میں مختلف مقامات پر اس کا اعادہ کیا۔ انہوں نے ۷ نومبر کو قاہرہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا :-

ایک اور مسئلہ بھی ایسا ہے جو میرے خیال میں آپ حضرات کے ذہن رسا کے لئے بھی ایسا ہی قریب ہے جیسا ہم پاکستانیوں کے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام ایک ترقی پسند اور متحرک دین ہے۔ یہ ایک ایسا دین ہے جو عقل و فکر اور غور و تدبر کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جو ہمیں زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ چلنا سکھاتا ہے۔ لیکن آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اس دین کے ساتھ ہم نے کیا کیا ہے؟ ایک طرف اس دین کو دیکھئے اور دوسری طرف عالم اسلام پر نگاہ ڈالئے، بات نکھر کر سامنے آجائے گی۔ آج ساری دنیا کے مسلمان سب سے زیادہ پیچھے اور سب سے کم تعلیم یافتہ ہیں۔ کیا یہ صورت حالات ایسی تشویش انگیز نہیں کہ ہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس پر غور کریں کہ اس قسم کے دین کے نام لیواؤں کی ایسی حالت کیوں ہو گئی؟ ہم سے کہاں غلطی ہوئی ہے اور اس کے ازالہ کی کیا صورت ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ ہر اس مسلمان کا فریضہ ہے جسے دیدۂ بینا عطا ہوا ہے کہ وہ سوچے کہ ہمارے اس زوال کے اسباب کیا ہیں؟ اور جس نتیجہ پر وہ پہنچے، اسے بلا خوف اور بے دھڑک واضح الفاظ میں قوم کے سامنے پیش کر دے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ہمارے مذہبی طبقہ اور مذہبی راہنماؤں نے مشکلات و مصائب کے ہجوم میں ہماری ملی روایات کے تحفظ و بقا کے لئے بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔ لیکن کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ وہ اس وقت کر رہے ہیں، اور جس طریق کی طرف ہماری راہنمائی کر سکتا ہے جس سے ہم زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کے قابل ہو سکیں؟ ممکن ہے آپ اس کے جواب میں کہہ دیں کہ (۱) ان کے لئے یہ بتانا کیا ضرور ہے اور (۲) ہم پر یہی کب لازم ہے کہ ہم زمانے کے تقاضوں کے ساتھ چلیں۔ میرا جواب یہ ہے کہ قوانین فطرت اور خود قرآن کریم ہمیں واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ جو لوگ اپنے اندر تبدیلی نہیں پیدا کرتے اور زمانے کے ساتھ نہیں چلتے، آخر الامر تباہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا، اگر ہم زمانے کے ساتھ چلنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔۔۔۔ اپنی کمزوریوں کا اعتراف اور انہیں دور کرنے کی کوشش نہیں کریں گے، تو ہم پھر دوسروں کے غلام

بن جاتیں گے ۔۔۔۔ اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اس مرتبہ کی غلامی، سابقہ دور کی غلامی کے مقابلہ میں، بہت زیادہ دیرپا ہوگی ۔　　(ڈان - ۱۰ نومبر ۱۹۶۰ء)

۹ نومبر کو انھوں نے قاہرہ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا :-

جرأتِ تحقیق

جوں جوں ہم دین کی روح سے دور ہٹتے گئے اور محض رسم پرستی کو دین سمجھ لیا، دین کی اصل و حقیقت کی جگہ سطحیت نے لے لی۔ غور و فکر کی جگہ توہم پرستی آگئی۔ اور جراتِ تحقیق کی جگہ روایت پرستی کی اندھی تقلید نے سنبھال لی۔ مسلمانوں کو تاج و تخت اور حکومتوں اور سلطنتوں کے چھن جانے سے اس قدر نقصان نہیں ہوا جس قدر نقصان اس سے ہوا کہ ان سے اس دین کی حکومت چھن گئی جس کا شعار آزادانہ تحقیق و کاوش تھا اور اس کی جگہ ان پر تنگ نظری مسلط ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی تو آگے بڑھتی گئی لیکن اسلام کا عمل دخل اس سے صدیوں پیچھے رہ گیا۔ اور وہ دین جس کا مقصود یہ تھا کہ وہ ایک مکمل، متحرک اور حرکت بخش ضابطۂ حیات بنے، محض پوجا پاٹ کی ظواہر پرستی کا ہو کر رہ گیا۔ نتیجہ یہ کہ اس دنیا میں، جو ہر آن آگے بڑھتی جا رہی ہے، مسلمان کی نگاہیں ماضی کی طرف جاتی ہیں۔

ہمارے نظامِ تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اسلام کو توہم پرستی اور تقلید و جمود کے اس جالے سے نکالیں جو اس پر چاروں طرف سے تنا گیا ہے، اور عصرِ حاضر کے علم اور سائنٹیفک تحقیقات کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اسے آگے بڑھاتے جائیں۔　　(ڈان - ۱۰ نومبر ۱۹۶۰ء)

اس سے پہلے انھوں نے جدہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا :-

اس ضمن میں سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم اپنے ذہن کو ماضی کے جمود اور تعطل سے آزاد کریں۔ دین کے ہر معاملہ میں دیانتدارانہ اور آزادانہ طور پر پوری پوری تحقیق کریں، اسلام پر اس انداز سے عمل کریں کہ وہ اس ایٹمی دور میں زمانے کی برق رفتاری کا ساتھ دے سکے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے ہم اپنے نظامِ تعلیم میں ایسی انقلابی تبدیلی کرنا چاہتے ہیں جس سے ہماری آنے والی نسلیں، دینی اور دنیاوی تعلیم کے امتزاج سے نہایت اچھے انسان اور نہایت اچھے مسلمان بن سکیں۔

اسلامی آئیڈیالوجی کے متعلق انہوں نے جدہ میں کہا :-

ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ اس کے سامنے کوئی اخلاقی اور روحانی آئیڈیالوجی ہو جس سے وہ اپنے مادی اور بلند اقدار کے تقاضوں میں توازن قائم کر سکے۔ ہمارے لئے یہ آئیڈیالوجی لازماً اسلام کی ہے۔ یہ امر موجبِ تاسف ہے کہ لوگ بالعموم اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ مذہب انسان کے فائدے

کے لئے دیا گیا تھا، انسان کو مذہب (کے کسی فائدے) کے لئے نہیں بنایا گیا تھا۔ اس حقیقت کو فراموش کر دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ مذہب کی قوتوں کو انسان کی خدمت کے لئے استعمال کیا جائے اسے زندگی کے حقائق سے یکسر الگ کر دیا گیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے (قاہرہ یونیورسٹی کی تقریب میں) یہ اعلان کیا کہ :-

پاکستانی اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ان کا ملک اسلامی آئیڈیالوجی کی تخلیق ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ ہماری ہستی کی سب سے مقدم وجہ جواز ہی یہی ہے، اور اگر ہم اس آئیڈیالوجی کو بصدق دل قبول نہیں کرتے تو ہم کبھی سچے پاکستانی نہیں بن سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ حتی الامکان، عصرِ حاضر کی سائنٹیفک تحقیقات کے ضمن میں، اسلام کا صحیح صحیح مطالعہ کریں۔ (ڈان ۱۰ نومبر ۱۹۶۰ء)

اور آخر میں انہوں نے دین کی پھر اسی اصل و حقیقت کو دہرایا جس کا ذکر پہلے کہا جا چکا ہے۔ انہوں نے جدہ کی تقریب میں فرمایا :-

آئینِ پاکستان

اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ دین کے اصول غیر متبدل ہوتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طریقے، زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ یہ تبدیلی صحت مندانہ ہو۔

پاکستان، اس بنیادی مسئلہ کے حل کے لئے امکان بھر کوشش کر رہا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ہماری کوشش یہ ہے کہ ہم ایسا آئین مرتب کریں جو ہمارے ایمان (FAITH) سے ہم آہنگ ہو اور جو لوگوں کو اس قابل بنا دے کہ وہ پاکستان کی آئیڈیالوجی کو زندگی کے ہر شعبہ میں عملاً نافذ پذیر کر سکیں۔ ہماری دوسری کوشش یہ ہے کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم میں ایسی تبدیلی پیدا کریں جس میں شروع ہی سے دینی اور دنیاوی تعلیم کا سلسلہ دوش بدوش چلے۔ (ڈان ۱۵ نومبر ۱۹۶۰ء)

یہ ہے وہ مقام جہاں کاروانِ پاکستان اس وقت کھڑا ہے۔ اس وقت آئین کمیشن آئندہ آئین کی تدوین کے سلسلہ میں مصروفِ کار ہے۔ امید ہے وہ دو ایک ماہ میں اپنی سفارشات پیش کر دے گا۔ اس کے بعد آئین کابینہ کی منظوری سے نافذ ہوگا۔ اس سلسلہ میں صدرِ محترم نے سال گذشتہ اس امر کا اعلان کر دیا تھا کہ

اگر کمیشن کی سفارشات (اسلامی آئیڈیالوجی کے) معیار پر پوری نہ اتریں تو کابینہ انہیں کبھی منظور نہیں کرے گی۔ اور اگر بفرضِ محال کابینہ نے انہیں منظور بھی کر لیا اور پارلیمان نے دیکھا کہ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں تو وہ دو تہائی اکثریت سے ان میں رد و بدل

کر سکے گی۔
(پاکستان ٹائمز، ۲۱ دسمبر ۱۹۵۹ء)

دُنیا بڑی بے تابی سے اس دن کا انتظار کر رہی ہے جب یہاں اسلامی اصول کے مطابق آئین نافذ ہوگا، کیونکہ اس آئین کے ساتھ ہماری ہی نہیں بلکہ ساری دُنیا کی تقدیر وابستہ ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ وہ اصول اس کے سوا اور کیا ہے کہ "مملکت پاکستان اپنے تمام اختیارات قرآن کریم کے غیر متبدل اصول، قوانین اور احکام کی حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کرے گی۔"

اس مقام پر ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنی اس گذارش کو ایک بار پھر دہرا دیں جسے ہم نے چھ ماہ قبل ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ:۔

ہم جناب محترم المقام صدر المملکت پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی خدمت میں بصد ادب و احترام گذارش کرتے ہیں کہ فطرت نے آپ کو ایک ایسے بلند مقصد کے لئے منتخب کیا ہے جس کی نظیر ہماری ہزار سالہ تاریخ میں کہیں نہیں ملتی ...... یہ مقصد جس کے لئے اقتدار آپ کے ہاتھوں میں منتقل ہوا ہے مملکت میں صحیح اسلامی نظام کا نفاذ ہے۔ اگر یہ مقصد آپ کے ہاتھوں پورا ہوگیا تو یقین جانیں آپ کا نام جبینِ عالم پر سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا۔ تاریخ انسانیت آپ کو زندہ اقوام میں بلند ترین مقام عطا کرے گی اور خدا اور اس کی کائناتی قوتیں آپ پر صلوٰۃ و سلام بھیجیں گی ...... سابقہ ارباب حل و عقد نے فطرت کی اس عظیم و جلیل پیشکش کی قدر نہ کی ...... خدا کرے آپ ان میں منفرد ثابت ہوں اور جو مسند بلند اب تک خالی پڑی ہے اس پر فائز المرام ہونے کا شرف حاصل کر سکیں۔ اور جب آپ حضور داور دادار جائیں تو خود اسلام آگے بڑھ کر آپ پر یہ کہتے ہوئے تبریک و تہنیت کے پھول برسائے کہ

یہ ہے وہ مرد بلند ہمت جس کی قوت بازو
سے زمانہ میں میرا سکہ رواں ہوا!!

فالحمد للہ رب العالمین۔